بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اب جبکہ حکومت کی طرف سے ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھادی گئی ہے تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ملک کے سارے بہی خواہوں اور سوچنے سمجھنے والے افراد کی خدمت میں ان سرگرمیوں کی نوعیت، ان کے جائز حدود اور ان کے مقصد و منہاج کے بارے میں چند گزارشات پیش کریں اور تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلائیں، تاکہ وہ صورتِ حال کی نزاکت کو سامنے رکھ کر کوئی اقدام کریں۔

صدیوں کے غلط رجحانات اور اخلاقی انحطاط کی وجہ سے سیاست کے بارے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ یہ لازمی طور پر چالاکی، عیاری، مکر و فریب اور زیردست آزاری کا کوئی مکروہ کاروبار ہے جس سے ہر شریف انسان کو دامن بچاکر رکھنا چاہیے۔ خصوصاً عملی سیاست سے تو اسے ہمیشہ دست کش ہی رہنا چاہیے، کیونکہ جو بھی اس میں ملوّث ہوگیا اس کے دین، ایمان، اور اخلاق کی خیر نہیں۔ اس نظریے کو دنیا پرستوں اور اقتدار کے بھوکوں اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں اُتارا ہے۔ سیاست کے بارے میں اس نوعیت کے "پند و نصائح" قومی اور ملکی سطح پر بھی کیے جاتے ہیں اور محدود پیمانے پر محلوں اور گلیوں میں بھی ان کا پرچار کیا جاتا ہے۔ جس طرح کسی محلّے کا آوارہ اور اوباش آدمی کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ظلم و ستم کی کارروائیوں پر کوئی شریف آدمی حرف گیری کرے یا عملاً

اس کے راستے میں مزاحم ہو، بالکل اسی طرح قومی سطح پر خود غرض اور ظالم لوگ کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی مخلص اور خلقِ خدا سے سچی اور بے لوث محبت رکھنے والا ان کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرے اور مظلوم اور بے بس انسانیت کو ان کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے عملی جدوجہد کرے۔ ہم میں سے ہر شخص کے روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ محلے کے ظالم افراد اُس عابد و زاہد کی بڑی تکریم کرتے ہیں جو ظلم کا خاموش تماشائی بلکہ اس سے بالکل بے تعلق ہو کر رہے۔ ظاہری طور پر ایسے شخص کا بڑا احترام کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ یہ صاحب بڑے خداترس بزرگ ہیں، انہوں نے دنیا اور اس کے معاملات سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس قسم کے بزرگ کی خداترسی سے ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ انسانوں سے اس کا کوئی ربط ضبط باقی نہیں رہا، اور" دنیا سے منہ موڑنے" کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اس نے ان ظالموں کی ستم رانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور انہیں اس بات کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں لوگوں کو ستائیں اور ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں، اسے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں۔

کسی ظالم اور ستم کش کے لیے اس سے زیادہ کوئی بات ناقابلِ برداشت نہیں ہو سکتی کہ کوئی پاکیزہ زبان اس کی کرتوتوں پر نفرین بھیجے اور کوئی نیک ہاتھ اسے ظلم سے باز رکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ ہر بُرا آدمی دوسرے بُرے آدمی کی تنقید تو گوارا کر لیتا ہے اور اپنے معاملات میں اس کی دخل اندازی کو بھی طوعاً و کرہاً برداشت کر لیتا ہے، مگر اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں ہوتی کہ بھلے آدمیوں اور نیک اور خداترس افراد کی طرف سے اس پر گرفت ہو اور عملاً اس کی بداعمالیوں کی مزاحمت کی جائے۔ ظالموں کے اس طرزِ عمل کے بہت سے اسباب ہیں مگر اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ایک ظالم کو اگر دوسرا ظالم ٹوکتا ہے یا اس کا راستہ روکتا ہے تو اس صورت میں تسلط اور بالادستی بہرحال ظلم ہی کی قائم رہتی ہے اور ظالموں کی چودھراہٹ پر کوئی آنچ نہیں آنے پاتی۔ یہ صورتِ حال ظالموں اور ستم کشوں کے لیے کسی جہت سے بھی تشویشناک نہیں

وہ ظلم کی بادشاہت میں بڑی آسانی کے ساتھ اخلاق سوز حرکات کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر پڑتا ہے کہ ایک وقت میں ظالموں کا ایک ٹولہ غلبہ حاصل کرتا ہے اور دوسرے وقت میں کسی دوسرے ٹولے کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ عوام بہرحال ظلم کے اندھیروں میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے دل و دماغ حق و انصاف کی ضیا پاشیوں سے منور نہیں ہونے پاتے۔ اس بنا پر دنیا کا ہر ظالم فرد یا گروہ یا برسرِ اقتدار طبقہ دوسرے ظالموں کی کارروائیوں کو کسی حد تک برداشت کرتا ہے، کیونکہ اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہوتا ہے کہ اس کی شکست سے ظلم کی حکمرانی کو تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ اگر وہ وقتی طور پر ایک غیر مؤثر قوت بن بھی گیا ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ حالات میں تغیّر کے ساتھ وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرے گا اور وقتی طور پر جو زک اسے پہنچی ہے اس کی کسر کسی اور وقت نکل جائے گی۔

ظالم اگر فی الحقیقت کسی چیز کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے تو وہ نیکی، شرافت، پاکبازی، خدا ترسی اور حق و صداقت کی بالادستی ہے۔ اگر یہ ساری صفات صرف کتابوں کی زینت یا وعظ و تلقین کے عنوان بنی رہیں یا چند افراد خاموشی کے ساتھ انہیں اپنے سینے سے لگائے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے رہیں تو ظالم و جابر اور مستبد گروہ اس صورتِ حال کو اپنے لیے بڑا اطمینان بخش سمجھتے ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی تعرّض نہیں کرتے۔ وہ اِن صفات کو اپنے لیے خطرے کا الارم اس وقت محسوس کرتے ہیں جب کوئی فرد یا گروہ آگے بڑھ کر عملاً انہی اوصاف کی سیادت و برتری قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس وقت ظلم و استبداد کے سارے لشکر، خدا کے سرکشوں اور باغیوں کی ساری افواج مجتمع ہو کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ وہ اس خطرہ کو بھانپ لیتی ہیں کہ اگر ظلم کی جگہ انصاف، بے حیائی اور زبردست آزادی کی جگہ شرافت اور عدل، سیاسی معاشی اور معاشرتی دھڑے بندیوں کی جگہ حق پسندی، اور مکر و فریب کی جگہ دیانت داری اور اخلاص کی حکمرانی قائم ہوگئی تو پھر ان کے لیے اپنے ناجائز کاروبار چلانے اور ناجائز مراعات حاصل کرنے

اور لوگوں کو ستانے کے کوئی امکانات باقی نہ رہیں گے۔ اس کے علاوہ جب ستم زدہ عوام ایک مرتبہ حق و انصاف کی عملداری سے لذت آشنا ہو جائیں گے اور وہ اس عظیم فرق کو اچھی طرح محسوس کریں گے جو باطل کی تاریکیوں اور حق پرستی کی ضیا پاشیوں میں پایا جاتا ہے۔ تو پھر ظالموں کے لیے دوبارہ باطل کی حکومت قائم کرنے میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ نیکی اور خدا ترسی کی بالادستی میں چند سال پورے اطمینان سے گزار لیتا ہے وہ پھر باطل کی حکمرانی کے عذاب کو بڑی مشکل ہی سے برداشت کر سکتا ہے۔

کفر و الحاد اور ظلم و استبداد کا نیکی و حق پرستی اور خدا ترسی کے بارے میں یہ رویہ اور احساس کوئی ایسی چیز نہیں جسے سمجھنے میں کوئی خاص دقت پیش آئے۔ آپ اسلام اور اسلامی حکومت کے بارے میں خالص علمی انداز پر جس قدر تحقیقی کام کرنا چاہیں کریں، برسرِ اقتدار طبقے اور دوسری باطل قوتیں آپ کی راہ میں قطعاً مزاحم نہ ہوں گی، بلکہ اس کارِ خیر میں آپ کی کسی حد تک معاونت و دستگیری بھی کر دیں گی۔ آپ جلسوں اور خطبوں میں عوام کو نیکی کی تلقین کریں تو اسے بھی باطل قوتیں برداشت کریں گی۔ آپ اپنی انفرادی زندگی میں تقویٰ اور پرہیزگاری اور ایمانداری کی تصویر پیش کریں۔ مگر باطل کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہوں تو آپ کے اس طرزِ عمل کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ البتہ سارے باطل گروہ نیکی اور خدا ترسی کے خلاف اس وقت مشتعل ہو کر صف آرا ہو جائیں گے جب آپ عملاً اس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس امر کے لیے کوشاں ہوں کہ اجتماعی زندگی کی زمامِ کار فساق و فجار اور خدا کے باغیوں کے ہاتھ سے نکل کر خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے نیکی اور خدا ترسی جب تک کسی معاشرے میں غیر مؤثر قوت بن کر رہے اس وقت تک تو اسے برداشت کیا جا سکتا ہے مگر جب یہ نیکی برائی کا تسلط توڑنے اور خدا پرستی اور حق و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس صورت میں باطل کے علم برداروں کی نظر میں اس سے زیادہ ناپسندیدہ اور شر انگیز چیز کوئی نہیں ہوتی اور یہ "سیاست بازی"، "اقتدار کی بھوک" اور "مذہب کا لبادہ" بن جاتی ہے۔ دوسرے

لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر نیکی بے اثر، مغلوب اور بے تعلق رہے تو یہ قابلِ قدر ہے مگر جب یہ باطل کا اقتدار ختم کرنے اور حق کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو یہ "دنیاداری" اور "سیاست کا بیکار اور غیر اخلاقی دھندا" ہے۔

اس طرزِ فکر کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ اجتماعی امور کو ایک خاص نہج پر ڈھالنے اور ایک خاص انداز پر چلانے کا کام دنیا پرستوں کے ہاتھ ہی میں رہنا چاہیے، اور با اخلاق، نیک اور خدا ترس لوگوں کو اس میں قطعاً دخیل نہ ہونا چاہیے، تاکہ یہ ظالم جس طرح چاہیں بے بس عوام کے سینے پر مونگ دلتے رہیں اور کوئی ان سے بازپرس کرنے والا نہ ہو۔

عملی سیاست کے خلاف یہ نفرت اور حقارت اور اخلاق اور دیانت سے اس کے بعید ہونے کا یہ تصور دراصل ظالموں اور ستم گروں کی ایک چالبازی ہے جس کے ذریعہ نیکی اور بھلائی کی حکمرانی قائم کرنے میں مزاحمت کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی منطق کتنی عجیب و غریب ہے کہ اگر خدا کے باغی اور اخلاق و دیانت سے عاری لوگ بے بس مخلوق کو ستائیں، اسے اس کے بنیادی حقوق سے محروم کریں اور اس کی گردن پر خدا بن کر مسلط ہوں تو پھر یہ سیاست بالکل جائز اور درست ہے۔ لیکن اگر خدا ترس اور نیک افراد خدا ترسی اور نیکی کی عملداری قائم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہوں تو پھر یہ ناپسندیدہ سیاست بازی ہے۔ سیاست کو دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے جو ایک مذموم کاروبار سمجھ لیا گیا ہے اس کے پیچھے ظالموں کا یہ ناپاک مقصد کارفرما ہے کہ نیکی اور خدا ترسی ایک طرف دبک کر بیٹھی رہے اور بدی کا دیو خدا کی زمین پر ننگا ناچ ناچتا رہے۔

سیاست اپنی حقیقت کے اعتبار سے حیاتِ انسانی کا کوئی ناپاک شعبہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنے مقصد و منہاج کے لحاظ سے وہی حیثیت رکھتا ہے جو خود انسانی زندگی کی حیثیت ہے۔ جس طرح انسانی زندگی بجائے خود ناپاک نہیں ہے بلکہ ایک خودغرض انسان اپنی زندگی کو خودغرضی

کا نمونہ اور ایک بے نفس انسان اسے ایثار کا پیکر بنا سکتا ہے، بالکل اسی طرح عیار اور چالاک افراد اور گروہ سیاست کو مکر و فریب کا کاروبار، اور خدا ترس اور پاکباز افراد اور گروہ اسے خدا کی رضا اور خلق کی خدمت کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ سیاست بجائے خود اپنی فطرت کے اعتبار سے دھوکہ اور چالبازی کا فن نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی ترتیب و تشکیل اور اسے ایک خاص راہ پر چلانے کا انداز اور نظم ہے۔ اس کے متعدد شعبے ہیں جن میں بنیادی طور پر کوئی خرابی نہیں پائی جاتی۔ جس طرح ایک باشعور فرد سب سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور پھر اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے لیے ضابطے مرتب کرتا ہے اور ان کے مطابق اپنے اخلاق و اطوار کو سنوارتا اور وسائل جمع کر کے مقصد کے حصول کی خاطر آگے بڑھتا ہے، اُسی طرح دنیا کی ہر ذی شعور قوم سب سے پہلے اس امر کا تعین کرتی ہے کہ اسے آخر کن مقاصد کے لیے زندہ رہنا ہے اور اپنی اجتماعی زندگی کو کیا رنگ دینا ہے۔ انہی مقاصد کی روشنی میں وہ اپنے لیے آئین اور دستور کو ترتیب دیتی ہے اور اس کے مطابق افراد کی سیرت اور قوم کے کردار کو ڈھالتی ہے۔ پھر اپنے قومی کردار کی اس پونجی اور مادی وسائل کی قوت کے بل بوتے پر منزل مقصود کی طرف گامزن ہوتی ہے۔

سیاست کا کام آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ شیرازہ بندی بعض مقاصد کے تحت اور بعض تدابیر کو اختیار کرنے ہی سے کی جاتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد اور ان تدابیر کو اختیار کرنے کے لیے اقدام ہی عملی سیاست ہے۔ اگر ایک فرد مقاصد کا تعین کیے بغیر اور اپنی زندگی کو کسی اصول اور ضابطے کا پابند بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو آخر ایک قوم کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کوئی مقصد متعین کیے بغیر، اور اپنے لیے کوئی آئین و دستور بنائے بغیر سفر حیات کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ جو لوگ "سیاست" کو ایک مذموم دھندا کہہ کر دیندار افراد اور طبقوں کو اس سے کنارہ کش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دیندار طبقوں کی طرف سے ان کے ناپاک عزائم کی مزاحمت نہ کی جائے تاکہ وہ قومی

زندگی کی شیرازہ بندی اپنے مقاصد کے مطابق کرنے اور ملک کے آئین و نظام کو اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دینے کے لیے آزاد رہیں۔

اسلام میں جس طرح تجارت اور صنعت و حرفت اور سارے کاروبار عبادت قرار پاتے ہیں جبکہ انہیں احکامِ خداوندی کے تحت سرانجام دیا جاتے، بالکل اسی طرح سیاست، یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی زندگی کی ترتیب و تشکیل کا کام بھی عبادت بن جاتا ہے، اگر اسے رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اور خالق کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق سرانجام دیا جائے۔ یہ بات بالکل بعید از قیاس بلکہ یکسر خلافِ عقل ہے کہ وہ دین جس نے رہبانیت کو انسان کا اپنا خود ساختہ اور غلط طرزِ عمل تبلایا ہے، جو انسان کی پوری زندگی کو خداپرستی کی بنیادوں پر اُستوار کرنے کا علمبردار ہے، جس نے اگر ایک طرف انسان کو انفرادی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے اصول دیئے ہیں تو دوسری طرف اس کی اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کے لیے بھی جامع اور متوازن ضابطے تجویز کیے ہیں، وہ سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دے کر خدا کے پاکباز بندوں کو اس سے کنارہ کشی کی تلقین کرے تاکہ خدا کے باغی جس طرح چاہیں، آزادی کے ساتھ دنیا میں گمراہی اور فسق و فجور پھیلاتے رہیں اور خداترس افراد یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہیں۔ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں سیاست انتہائی فیصلہ کن حیثیت سے اثرانداز ہوتی ہے اور سیاست کے ایوانوں ہی میں اس امر کے فیصلے کیے جاتے ہیں کہ قوم کو کن مقاصد کی تکمیل اور کس نوعیت کے اخلاقی ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ اس بنا پر دنیا کا کوئی فرد یا گروہ جو کچھ بھی شعور اور احساس رکھتا ہے، جسے اپنی قوم سے کچھ بھی محبت ہے وہ سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔

سیاست سے کنارہ کشی کا مشورہ دینے والوں میں جہاں چالاک اور عیار لوگ ملتے ہیں وہاں بعض خداترس اور نیک افراد بھی پائے جاتے ہیں جو بڑی سادگی سے یہ کہتے ہیں کہ تم افراد کو نیک بنانے کی کوشش کرو، نظمِ اجتماعی خودبخود درست ہو جائے گا۔ اس دلیل میں بعض لوگ بڑا وزن محسوس

کرتے ہیں۔ مگر اس دنیا میں اس سے بڑی سادہ لوحی اور اجتماعی معاملات سے عدمِ واقفیت کی کوئی دوسری مثال نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کا نظمِ اجتماعی بالکل ایک غیر مؤثر قوت ہے۔ وہ افراد کو بنانے اور بگاڑنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔ افراد نیک بننے اور دوسروں کو نیک بنانے میں بالکل آزاد ہیں اور اس کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کوئی ایسی چیز ہے کہ جب افراد نیک بن جائیں تو کسی جدوجہد کے بغیر وہ آپ سے آپ درست ہو جایا کرتی ہے۔ معلوم نہیں یہ لوگ کس طرح اس نوعیت کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان پاکباز افراد کا یہ نظریہ جن تین مفروضات پر قائم ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں۔ کسی قوم کی ہیئتِ حاکمہ کبھی ایسی غیر مؤثر اور غیر جانبدار قوت نہیں ہوتی کہ وہ خود بخود بغیر کسی مزاحمت کے افراد کے عزائم اور امنگوں کے مطابق ڈھلتی چلی جائے۔ حکومت کا ادارہ اجتماعی زندگی کی صورت گری کرتا ہے وہ بڑا با اختیار اور بڑی قوت کا مالک ہوتا ہے اور وہ افراد کی طرف سے لائی ہوئی ذہنی اور فکری تبدیلیوں کو خاموشی کے ساتھ قبول کرنے کے بجائے ان پر پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے اور عوام کو اپنے دل پسند افکار و نظریات کا تابع بناتا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں ہیئتِ حاکمہ بے وزن قوت نہیں رہی ہے۔ الناس علیٰ دینِ ملوکھم ایک ہمہ گیر صداقت ہے جس پر انسان کی پوری معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی گواہ ہے۔ ماضی بعید میں جب حکومت کا دائرہ بالکل محدود تھا اور اس کا کام صرف کسی ملک اور قوم کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانا اور داخلی طور پر اس کے اندر امن و امان قائم کرنا تھا، اس وقت بھی اس میں بڑی قوت اور اثر آفرینی تھی محلات میں جنم لینے والے افکار و نظریات، رسوم و عادات اور خوب و ناخوب کے معیارات عوام کے اندر خود بخود سرایت کرتے چلے جاتے تھے اور عام آبادی شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں اپنانے کی کوشش کرتی تھی۔ جو لوگ حکومت کی اصلاح کو افراد کی اصلاح کا بالکل منطقی نتیجہ سمجھتے ہیں ان کے اس استدلال کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر تاریخ میں پاکباز اور خداترس افراد اور جابر حکمرانوں کے درمیان آویزش کا کوئی نام و نشان نہ ملنا چاہیے۔ کیونکہ اصلاح کی جو لہریں افراد کے قلب و دماغ کی

تطہیر کی ذمہ دار تھیں وہ لازمی طور پر بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھ کر اقتدار کے ایوانوں کو بھی تمام آلائشوں سے پاک کر دیتیں۔ پھر اس راہ میں مزاحمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر تاریخ کے صفحات بالکل اس کے برعکس شہادت پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب بھی اصلاح کی کوئی تحریک شروع ہوئی تو حکمرانوں نے خاموشی کے ساتھ اس کے اثرات قبول کرنے کے بجائے اسے دبانے اور ختم کرنے کے لیے کوئی تدبیر استعمال کرنے میں دریغ نہ کیا اور اس بات پر پورا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دکھایا کہ عوام کسی طرح اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں بلکہ ان کی غلامی میں گرفتار رہ کر زندگی بسر کریں۔ دنیا کی آخر کسی ایسی دینی اور اصلاحی تحریک کی نشاندہی کیجیے جو ظالموں اور ستم کشوں کی حکمرانی کو انصاف اور خدا ترسی سے بدلنے کا عزم لیکر اٹھی ہو اور حکومت کے ایوانوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا ہو اور برسرِ اقتدار طبقے محض تلقین و ترغیب سے خود بخود درست ہو گئے ہوں۔ انسان کی پوری تاریخ اس قسم کی خوش فہمیوں سے خالی ہے۔ ماضی میں تو ہیئتِ حاکمہ کا دائرۂ کار بالکل محدود تھا۔ ذرائع حمل و نقل بھی اتنے دشوار تھے کہ کوئی حکومت کوشش کے باوجود اپنی ساری رعایا کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھنے سے قاصر تھی۔ حکومت کے کارناموں کو اچھالنے اور اس کے افکار و نظریات کو پھیلانے کے لیے نشر و اشاعت کی وہ سہولتیں بھی میسّر نہ تھیں جو آج ہیں۔ اُس وقت اگر وہ اصلاح کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہو سکتی تھی تو آج جبکہ اس کا دائرۂ کار پوری زندگی پر مُحیط ہے، اس کی قوت و طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے، اس کی وسیع پراپیگنڈہ مشنیری لوگوں کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کی غیر معمولی قوت رکھتی ہے، اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ افراد کی اصلاح سے وہ خود بخود دُرست ہو جائے گی انتہائی سادگی ہے۔

پھر اس انداز پر سوچنے والے حضرات اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ پہلے بادشاہ اور حکمران زندگی کے بارے میں اپنے کوئی بندھے ٹکے افکار و نظریات نہ رکھتے تھے۔ ان کا مقصد صرف اسی قدر ہوتا تھا کہ کسی طرح وہ عوام کی گردنوں پر مُسلّط رہیں اور ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر دادِ عیش دیتے رہیں۔ ان کو غرض صرف اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے سے تھی۔ اس بنا پر جب اصلاح کی کوئی تحریک نمودار ہوتی تو وہ یہ دیکھتے تھے کہ کیا اس کا رُخ براہِ راست ان کی مسندِ اقتدار کی طرف

تو نہیں ہے، اور اس جائزہ کے بعد اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی مسند ابھی اس کی زد سے محفوظ ہے تو وہ اُسے کچھ وقت کے لیے گوارا بھی کر لیتے تھے۔ اس وقفے میں مصلحین کو کام کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ مگر آج صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والے افراد اور گروہ اپنے دل پسند افکار و نظریات کے علمبردار کی حیثیت سے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور پھر اپنے ان افکار و نظریات کو نہ صرف حکومت کے وسائل کی مدد سے پھیلاتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر پوری اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ہر اس اصلاحی تحریک کو اوّل روز ہی سے حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے تصورات برسرِ اقتدار طبقے کے نظریات سے کچھ بھی مختلف ہوں۔ آج کی حکومتیں عوامی تحریکات کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس ہوتی ہیں اور وہ ایک ثانیہ کے لیے بھی ان تحریکوں کو برداشت نہیں کرتیں جو اُن کے نظریات کے خلاف کوئی دوسرے نظریات اور ان کے پیش کردہ اخلاقی معیارات کے برعکس کوئی دوسرے اخلاقی معیارات پیش کرنے کا عزم رکھتی ہوں۔ اگر کچھ وقت کے لیے انہیں برداشت کیا جاتا ہے تو اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے وجود سے کسی ملک یا قوم کی اجتماعی زندگی میں تبدیلی پیدا ہونے کا خطرہ پیدا نہ ہو۔ دوسرے ان کی سرگرمیوں سے کسی دوسری زیادہ فعّال اصلاحی تحریک کی قوت توڑنے میں برسرِ اقتدار طبقہ کو مدد ملنے کے امکانات ہوں۔

دنیا کا ہر حکمران گروہ مخالف تحریکات کو ناکام بنانے میں بڑی چابکدستی سے مختلف چالیں چلتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی چالبازی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ نظریاتی اور فکری اعتبار سے باہم متفق ہوں اور ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کا عزم رکھتے ہوں اُن کے اندر مختلف طریقوں سے انتشار پیدا کر کے انہیں آپس میں لڑا دیا جاتا ہے تاکہ ان کی قوتیں آپس کی سر پھٹوں میں ضائع ہو جائیں اور برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف استعمال نہ ہونے پائیں۔

ان مقدس افراد کا "عوام کی اصلاح سے حکومت کی اصلاح" کا نظریہ جس دوسرے مفروضے پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ افراد اپنی اور دوسروں کی اصلاح کر لینے میں بالکل آزاد اور اس پر پُوری طرح قادر ہیں۔ یہ نظریہ بھی خلافِ واقعہ ہے کچھ لوگ ذکر و فکر کی محفلیں آراستہ کرنے کو مذہبی آزادی خیال کرتے ہیں تو یہ اُن کی بڑی خوش فہمی ہے۔ دَورِ جدید کے حکمران اتنے بیوقوف اور غبی نہیں ہیں کہ وہ کسی آرڈی ننس کے ذریعہ ان محفلوں پر کوئی پابندی عائد کر دیں۔ اس نوعیت کی سرگرمیوں سے وہ براہِ راست کبھی تعرض نہیں کرتے۔ البتہ ان محفلوں کے گرد و پیش کی دنیا میں ایسا روح فرسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ بالآخر یہ محفلیں خود بخود سونی پڑ جاتی ہیں۔ ذرا سوچیے، آخر کیا وجہ ہے کہ بڑے دیندار اور نیک گھرانوں کے اندر پیدا ہونے والی اور نیک اور پاکیزہ فضا کے اندر پلنے والی اولاد میں سے آج خدا کے باغی اور سرکش نوجوان نکل رہے ہیں؟ بعض لوگ اس المیہ کو بخت و اتفاق پر محمول کر کے اجتماعی ماحول کی غیر معمولی قوت اور اثر آفرینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ محض فریبِ نفس ہے۔ اس المیہ کی سب سے بڑی وجہ ایک ہی ہے کہ آج بچہ اپنے گرد و پیش جو ماحول پھیلا ہُوا پاتا ہے وہ دینی افکار اور اخلاقی احساسات کے لیے سخت زہر آلودہ ہے اور ماں باپ بچے کو اس سے جتنا بھی بچا کر رکھیں وہ اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے خطرناک جراثیم لازمی طور پر اس میں سرایت کر کے اس کے اندر کفر و الحاد اور فسق کا زہر بھر دیتے ہیں۔ وہ اگر بعض مصالح کی بنا پر علانیہ طور پر اس کا اظہار نہ بھی کرے تو بھی اس کے سوچنے سمجھنے کے انداز، اس کی معاشرت اور اس کی عادات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسے دین کے بجائے کفر عزیز ہے۔ پاکستان کے گذشتہ بائیس سال کے حالات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ آیا اس مدت میں اسلامی تعلیمات کو فروغ حاصل ہُوا ہے یا کفر اور الحاد کو شہ ملی ہے۔ حالانکہ ذکر و فکر کی محفلوں پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پھر عقل یہ ماننے پر بھی کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ انسان فطری طور پر خدا سے بغاوت، دین سے بیزاری اور اخلاقی اقدار سے انحراف کی طرف مائل ہے۔ شیطان کی قوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر شیطان اپنی قوت انسان کے

اندرونی احساسات سے زیادہ خارجی ماحول سے حاصل کرتا ہے کیونکہ خدا نے انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بھلائی کے جذبات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اگر خدا سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کی فطرت کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس غلط ماحول کا اثر ہوتا ہے جو اس کی صالح اور نیک فطرت کو مسخ کر دیتا ہے۔ اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کو سیاست بازی کہہ کر نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھنا خدا کے بندوں کو فریب دینا ہے۔

کسی لادینی حکومت میں مذہبی آزادی کا بھرم اُسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک مذہبی اور دینی سرگرمیاں اعتقادی مسائل کی محض تشریح و توضیح تک محدود رہیں۔ مگر جس لمحہ ان سرگرمیوں سے یہ مترشح ہونے لگتا ہے کہ ان کا مقصد اجتماعی زندگی کو نیکی اور خدا ترسی کی بنیاد پر اُستوار کرنا ہے تو اسی وقت ان کی روک تھام شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً آپ پردہ کے بارے میں جس قدر چاہیں وعظ کرتے پھریں کوئی آپ سے بازپرس کرنے والا نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ اُن محرکات، اُن اداروں اور اُن قوانین اور ضابطوں میں تبدیلی لانا چاہیں جن سے بے پردگی اور فحاشی پھیلتی ہے تو اس کی آپ کو قطعاً اجازت نہ دی جائے گی اور آپ کو اس دینی فرض کی انجام دہی سے پوری قوت کے ساتھ روک دیا جائے گا۔

جس انداز سے آج تاریخ مرتب کی جاتی ہے اس سے یہی تأثر ملتا ہے کہ پہلے حکمران بڑے سفاک اور جابر تھے اور اُن کے مقابلے میں آج کے حکمران بڑے انصاف پسند اور وسیع الظرف ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ جس قدر جبر و استبداد کا مظاہرہ دورِ حاضر کی حکومتیں کر رہی ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی ماضی کے حکمرانوں میں نہیں ملتا۔ اُن کا جبر زیادہ تر اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ کسی سرکش کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، یا عوام سے بعض ناجائز ٹیکس وصول کر لیے، یا کسی کی زمین اور مکان چھین لیے۔ مگر ان میں یہ قوت قطعاً نہ تھی کہ

ایک پوری کی پوری قوم کو اس کی مرضی کے علی الرغم عملاً باطل کا پرستار بنا دیں اور اُسے محسوس تک نہ ہونے دیں۔ کیا آج نظریاتی اختلاف کی وجہ سے برسرِ اقتدار طبقے اپنے مخالفین کی جانیں نہیں لیتے؟ کیا معمولی معمولی وجوہات کی بنا پر ان کی جائدادیں ضبط نہیں کر لی جاتیں؟ کیا آئے دن ہم لاتعداد افراد کو سیاسی انتقام کا تختۂ مشق بنتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ آج کی رعایا ظاہری طور پر بھی ماضی کی بہ نسبت حکمرانوں کے ہاتھوں زیادہ ستم زدہ ہے۔ مگر جہاں تک اس زمانے کے حکمرانوں کے چھپے ہوئے مظالم اور جبر و استبداد کا تعلق ہے، ماضی کے حکمرانوں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ آج کے حکمران گروہ سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ عوام کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، ان کے اخلاق کو مسخ کرتے ہیں، ان کی غیرت کا جنازہ نکالتے ہیں، مگر اُن کی اِن ظالمانہ کارروائیوں کا عوام کو بہت کم احساس ہوتا ہے۔ پہلے حکمران اگر اخلاقی لحاظ سے بگڑتے تو زیادہ سے زیادہ محلّات میں رقص و سرود کی محفلیں جما لیتے تھے۔ مگر آج کے حکمران حکومت کے وسیع ذرائع سے کام لے کر مختصر سی مدّت میں پوری قوم کو آبرو باختہ بنا دیتے ہیں۔ پہلے جو بُرائیاں محلّات تک اور چند افراد کے درمیان محدود رہتی تھیں وہ اب ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات اور درسی کتابوں کے ذریعہ آناً فاناً پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ انفرادی اصلاح کا پروگرام آخر ان اجتماعی مفاسد کی کس طرح روک تھام کر سکتا ہے جبکہ ان کی پُشت پر حکومت کے سارے وسائل ہوں۔

سیاست سے کنارہ کش رہ کر اصلاحِ احوال کی کوشش کرنے والوں کا یہ تیسرا مفروضہ بھی بالکل غلط ہے کہ عوام ملک کی ہیئتِ حاکمہ کو جس طرح چاہیں تشکیل دے کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق جو کام لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ ہیئتِ حاکمہ کی تبدیلی بڑا صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور پھر اسے اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ قوم کے غالب رجحانات کے تابع رہ کر کام کرے بڑا دقّت طلب مسئلہ ہے۔ ہیئتِ حاکمہ چند افراد کا نام نہیں جنہیں مسندِ اقتدار سے ہٹا کر اور ان کی جگہ دوسرے افراد کو وہاں بٹھا کر اصلاحی کوششیں کامیاب بنائی

جا سکتی ہیں۔ دورِ جدید میں کسی ملک کی انتظامی مشینری خاص طور پر اس کے اونچے عہدیدار اس ملک کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں پوری قوت سے اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ ان تمام اصلاحی کوششوں کو ناکام بنا دیتے ہیں جنہیں وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ یوں تو ہر ملک میں ہیں، مگر خاص طور پر ان ممالک میں جہاں تختِ اقتدار پر متمکن ہونے والے افراد آمرانہ رجحانات رکھتے ہوں، یہ سیاسی جوڑ توڑ میں ہر لمحہ مصروف رہتے ہیں اور اپنے دل پسند افکار کو مسلط کرنے کی غرض سے اپنے ڈھب کے افراد اور گروہوں کو آگے لانے اور اپنے نظریات کے مخالف تصورات کے علمبردار افراد اور گروہوں کو دبانے کے لیے ہر وقت سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ غیر جمہوری اور نیم جمہوری ممالک میں تو یہ قوم کے سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ سمجھنا کہ محض تبلیغ کی مدد سے یہ لوگ خود بخود دین کے علمبردار بن جائیں گے، یا حکومت کا مزاج اور نظام آپ سے آپ بدل جائے گا، بہت بڑی خام خیالی ہے۔

اجتماعی زندگی کی غیر معمولی قوت، موجودہ زمانے کی حکومت کا وسیع دائرۂ اختیار، اور ہیئتِ حاکمہ کی زبردست طاقت کو سامنے رکھ کر ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا عملی سیاسیات میں پوری طرح شریک ہوتے بغیر ہم ملک میں کوئی ایسی ہمہ گیر تبدیلی لا سکتے ہیں جس کے ذریعہ یہاں الحاد کے بجائے اسلام کی عملداری قائم ہو اور اللہ کا دین ملک کے رہنے والوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس بن جائے؟ درحقیقت اس تبدیلی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اس مرکز کو خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں منتقل کیا جائے جسے عرفِ عام میں اقتدار کہا جاتا ہے، تاکہ قومی دولت اور ملک کے وسیع ذرائع کفر اور الحاد کو ترقی دینے کے بجائے اسلام کی سربلندی کے لیے صرف ہوں۔ مگر یہ عجیب قسم کی خدا پرستی ہے کہ جس سرزمین کو مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دے کر اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے حاصل کیا تھا، اس پہ اگر کچھ لوگ لادینی نظریات مسلط کرنے کی کوشش کریں تو دیندار حضرات ٹھنڈے پیٹیں اس کے خاموش تماشائی بنے رہیں، مگر

جونہی کوئی گروہ ان کے مقابلہ میں اسلامی اصولوں کا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرے، یہ حضرات فوراً شور مچا دیں کہ یہ تو سیاست بازی اور دنیاداری ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے اپنے منشور میں حسب ذیل مقاصد کا اعلان کیا ہے:

جماعت اسلامی پُرامن آئینی اور جمہوری طریقوں سے نظامِ حکومت کو بدلنا چاہتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے:

— جو قرآن و سنت کے اتباع کی پابند اور خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیرو ہو، جس میں اسلام کے اصول و احکام پوری طرح کارفرما ہوں،

— جو برائی کو مٹائے، نیکی کو پروان چڑھائے اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرے،

— جو ظلم، ناجائز استحصال اور اخلاقی بے راہ روی کی ہر شکل کو مٹائے، اسلامی اقدار کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیرِ نو کرے، اور زندگی کے ہر پہلو میں عدل قائم کر دے،

— جو ایک خادمِ خلق ریاست ہو، ہر شہری کو اس کی بنیادی ضروریات (غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج) کی فراہمی کی ضمانت دے، رزقِ حلال کے دروازے کھولے، کسبِ حرام کے دروازے بند کرے، تمام جائز ذرائع سے ملک کی دولت بڑھائے اور اس دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔

— جو لوگوں کے چیخنے چلانے سے پہلے ان کی ضرورتوں کو سمجھے اور فریاد سے پہلے ان کی مدد کو پہنچے،

— جو درحقیقت عوام کی خیرخواہ ہو اور عوام اس کے خیرخواہ، جس میں لوگوں کے تمام بنیادی حقوق پوری طرح محفوظ ہوں،

— جو صحیح معنوں میں ایک جمہوری حکومت ہو، عوام اپنی مرضی سے جن لوگوں کو اس کا اقتدار سونپنا چاہیں وہی انتخابات کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آئیں، اور عوام جنہیں اقتدار سے ہٹانا چاہیں انہیں انتخابات کے ذریعہ سے بآسانی ہٹایا جاسکے۔"